(غلام گردش)

مٹی

عرصے کے بعد تاندلیاوالہ جانے کا اتفاق ہوا۔شائد چار سال سے زیادہ یا اس سے بھی طویل وقت گزرنے کے بعد۔ویسے وقت کی سب سے ظالم بات یہ ہے کہ گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ڈھلتی ہوئی عمر میں تو دن لمحوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔مہینے چند گھنٹے بن جاتے ہیں اور سال بس پل جھپکتے ہی بسر ہو جاتے ہیں۔وقت گزرنے کے آثار انسانی چہروں پر جھریوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ذہن میں خوشی اور غمی کی خندقیں بنا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ فیصل آباد نام کا کوئی شہر ہی نہیں تھا۔لائل پور شہر، انگریزوں نے آباد کیا تھا۔آبادکاروں کا شہر۔پھر سعودی عرب کے فرمانروا، شاہ فیصل کے شہید ہونے کے بعد، شہر کو انہی کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ویسے یہ عجیب وغریب سی سرکاری حرکت صرف ہمارے جیسے ملکوں میں ہی ہو سکتی ہے۔درست ہے کہ سعودی عرب سے ہمارے اَز حد بہتر تعلقات ہیں۔مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ دنیا کے کسی ملک نے کسی پاکستانی لیڈر کے مرنے کے بعد اپنے کسی شہر کا نام اسکے نام سے تبدیل کیا ہو۔کیا بھٹو صاحب اور جنرل ضیاء کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ہمارے بہترین دوست ممالک نے اپنے شہروں کا نام تبدیل کیا تھا۔خیر، اب اس بحث کا کوئی جواز نہیں۔ذاتی طور پر میں فیصل آباد کا نہیں بلکہ لائل پور کے نام میں زیادہ اُنسیت محسوس کرتا ہوں۔ممکن ہے کہ فیصل آباد کے نئے باسیوں کو یہ جذباتی وابستگی درست نہ لگے۔پر شہروں اور ملکوں پر انکے ناموں کی حد درجہ تاثیر ہوتی ہے۔یہ تاثیر انسانوں پر بھی ہوتی ہے۔لائل پور، فیصل آباد بن گیا۔اب کچھ نہیں ہو سکتا۔شائد ہونا بھی نہیں چاہیے۔

گزشتہ دن محسوس ہوا کہ وسطی پنجاب میں اب روایتی قصبے ختم ہو چکے ہیں۔اب چھوٹے چھوٹے شہروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ایسے شہر جنکی آبادی یورپ کے درمیانے درجے کے شہروں سے بھی حد درجہ زیادہ ہے۔گمان ہے کہ تاندلیانوالہ کی آبادی اب چار پانچ لاکھ ہوگی یا شائد اس سے بھی زیادہ۔مگر نصف صدی قبل، یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔اختصار کے ساتھ تاندلہ منڈی کہا جاتا تھا۔شہر کے عین درمیان میں غلے کی ایک وسیع وعریض منڈی تھی۔اردگرد پکی دیوار تھی اور اس میں لوہے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔کناروں پر آڑھتیوں کی دکانیں موجود تھیں۔دکانوں کے سامنے پختہ فرش پر غلہ اور بوریاں موجود ہوتی تھیں۔شائد آپکے ذہن میں یہ سوال ہو کہ بچپن میں اس قصبے میں رہا ہوں۔بالکل نہیں۔میں لائل پور میں پیدا ہوا۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیڈٹ کالج حسن ابدال چلا گیا۔تاندلیاوالہ، سال میں صرف دو یا تین بار آنے کا اتفاق ہوتا تھا۔وہ بھی چند دنوں کیلئے۔تقسیم کے بعد میرے دادا، راؤ اختر پاکستان آئے تو خاندان سمیت تاندلہ منتقل ہو گئے۔راؤ اختر، حد درجہ سخت گیر انسان تھے۔اس طرح کے لوگ اب کم نظر آتے ہیں۔ویسے اُس وقت بھی بہت کم تھے۔انکو مقامی زبان میں "راٹھ راجپوت" یا راٹھ رانگڑ کہا جاتا ہے۔راؤ اختر کی ذہن میں مکمل تصویر موجود ہے۔انتہائی بارعب شخصیت، درمیانے درجے کی داڑھی اور لمبی لمبی مونچھیں۔ہاتھ میں اکثر ایک عصا ہوتا تھا۔کُرتے پاجامہ میں زیب تن، یہ انسان رعب اور دبدبے کی ایک اچھی مثال تھا۔مالی حالات مہاجرین کے کیا ہونگے۔جو زرعی زمین ملی، اس پر محنت کی اور خدا نے راستے آسان کرنے شروع کر دیے۔جب بھی عید پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو دادا جی، ہمیشہ اپنے بڑے سے مکان کی بیٹھک میں لوگوں سے گھرے

ہوتے تھے۔انکی حیثیت ایک سرپنچ کی سی تھی۔عام لوگوں کے مسائل حل کرنا،مسافروں کیلئے گھر سے باہر رہنے کا مناسب انتظام کرنا اور مقامی سیاست میں عمل دخل ہمیشہ سے انکا وطیرہ رہا تھا۔یاد ہے کہ ساٹھ کی دہائی میں بی ڈی کا نظام شروع ہوا تھا۔راؤ اختر بی ڈی ممبر تھے۔اَنا اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ لائل پور کے ڈپٹی کمشنر،تاندلہ کی میونسپل کمیٹی کے دورے پر آیا،وہاں آ کر کہا کہ شہر کے بی ڈی ممبران کو بلایا جائے۔کمیٹی کے عملہ نے مشورہ کیا کہ راؤ اختر نہیں آئینگے۔کیونکہ اکثر افسران ملاقات کیلئے انکے گھر جاتے ہیں اور انہیں ایک دو دن پہلے بتانا پڑتا ہے۔ڈپٹی کمشنر نیا تھا۔یقین ہی نہ آیا کہ ضلع میں ایک ایسا معتبر شخص بھی ہے جو اسکے بلانے پر بھی نہیں آتا اور اسے پہلے بتانا پڑتا ہے۔خیر کمیٹی سے ہرکارہ،ڈرتے ڈرتے ہمارے آبائی مکان پر آیا۔راؤ اختر دوپہر کو آرام کر رہے تھے۔بڑی مشکل سے بتایا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب ملاقات کیلئے بلا رہے ہیں۔دادا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ میرے آرام کرنے کا وقت ہے۔اگر صاحب ملنا چاہتے ہیں تو دوپہر کے بعد گھر تشریف لے آئیں۔جب یہ جواب ڈی سی کو پہنچا تو وہ اَز حد حیران ہوا۔ملنے کیلئے خود آیا اور اسکے بعد یہ ملاقات،ذاتی تعلق میں بدل گئی۔دراصل روایتی بزرگ تقریباً ایک جیسے ہوتے تھے۔اولاد کے ساتھ سختی کا رویہ روا رکھنا عام تھا۔میرے والد یعنی راؤ حیات سب سے بڑے تھے۔وہ بھی دادا مرحوم کے سامنے انتہائی احتیاط سے گفتگو کرتے تھے۔چچا سلیمان،چچا عبدالرحیم،چچا اسلم اور چچا اکرم تو باقاعدہ دادا سے گھبراتے تھے۔ویسے چچا سلیمان انتہائی مدہم اور شائستہ طبیعت کے مالک تھے۔ہر ایک سے بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔چچا اسلم،فیصل آباد کے نامور وکیل بنے۔جوانی میں انتقال ہو گیا۔جب تک زندہ رہے پنجاب بار کونسل کے ممبر رہے۔اس الیکشن میں انہیں کبھی شکست نہیں ہوئی۔چچا عبدالرحیم جوانی میں سیلانی طبیعت کے مالک تھے۔بچوں سے خوب شرارتیں کرتے تھے۔تاندلیاوالہ سے سمندری منتقل ہو گئے اور وہاں بہت اچھی وکالت کی۔اب پیرانہ سالی کا شکار ہے اور اکثر بیمار رہتے ہیں۔بڑھاپا بھی ویسے کیا تکلیف دہ دور ہوتا ہے۔بڑے بڑے تن آور درختوں کو خشک ٹہنی بنا کر رکھ ڈالتا ہے۔چچا اکرم ماشاء اللہ صحت مند ہیں۔کل کی تقریب انہی کے ایک بیٹے کا ولیمہ تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی کی بارات تھی۔

تاندلیانوالہ جا کر ترقی کا ایک بھرپور احساس ہوا۔ستیانہ روڈ سے آئیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔انتہائی خوبصورت سڑکیں اور ہر طرف دکانیں ہی دکانیں۔تحصیل کے سرکاری ہسپتال کے سامنے سے گزرا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی کافی حد تک بہتر طریقے سے کام کر رہا ہے۔سرکاری ایمبولینس بھی موجود تھی اور ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر بھی۔یہ کہنا تو مبالغہ آرائی ہوگی کہ وہ ایک بہت اچھا ہسپتال ہے۔مگر موجودہ حالات میں ابتدائی طبی امداد کیلئے ایک اچھی کوشش ہے۔نہر کے ساتھ ساتھ زندگی کے بھرپور آثار تھے۔جب شادی گھر پہنچا تو جدید طرز کی ایک عمارت سامنے موجود تھی۔وسیع و عریض ہال اور بہت اعلیٰ فرنیچر دیکھ کر احساس ہوا کہ اب شادیوں کی تقاریب منعقد کرنا کتنا آسان اور بہتر ہو چکا ہے۔ہاں،نہر کے ساتھ سکولوں سے چھٹی کا وقت تھا۔درجنوں کی تعداد میں طلباء اور طالبات گھر جا رہے تھے۔سکولوں کی چھٹی کے وقت ہر طرف بچے ہی بچے تھے۔ویسے بڑھتی ہوئی آبادی ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ہر طرف انسانی سر ہی سر نظر آتے ہیں۔نوجوان نسل کیلئے روزگار کیسے مہیا کرینگے۔اس جہت پر سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اتنی کثیر آبادی کو باعزت روزگار دینا تقریباً ناممکن ہے۔مگر یہ سچ تسلیم کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ہمارے جیسے معاشروں میں سچ بولنا ویسے ہی

ایک مشکل عمل ہے۔ یہاں سچ بولنے والے، اکثر مشکلات کا شکار نظر آتے ہیں۔ جھوٹ کی وادی میں، حقیقت اور سچ کے پیڑ لگانا بہت مہنگا پڑتا ہے۔

شادیوں کا ایک بہت خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ خاندان کے ہر فرد سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ انفرادی خوشی تو ہے ہی مگر اسکا اجتماعی پہلو بھی بہت خوبصورت ہے۔ چچا اکرم کا بڑا بیٹا شہزاد، امریکہ سے آیا ہوا تھا۔ حد درجہ انکساری سے بات کرتا ہے۔ امریکہ کی شائستگی اسکی شخصیت میں جھلکنے لگی ہے۔ ہاں، پھوپھا مجاہد سے بھی نشست رہی۔ انہیں مجاہد بھائی کہتا ہوں۔ سکول میں مجھ سے تین سال سینئر تھے۔ اسلیے رشتہ داری سے زیادہ دوستی ہے۔ بھائی مجاہد ایک وجیہہ انسان ہیں۔ سمندری میں ایسے بسے کہ پھر باہر نکل کر نہیں دیکھا۔ انکے ساتھ دوستی اور بے تکلفی کا نایاب رشتہ ہے۔ انکا بیٹا اب میونسپل کمیٹی کا چیئرمین ہے۔ بھائی مجاہد کی اولاد انکا روایتی انداز میں دلی ادب کرتی ہے۔ ویسے شائد ابھی ہم ان خوش قسمت خاندانوں میں سے ہیں، جن میں چھوٹے اپنے بڑوں کی بھرپور عزت کرتے ہیں۔ یہ روایت اب کافی حد تک ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بھائی مجاہد نے بھی اپنی طرز کی شاہانہ زندگی گزاری ہے۔ بچپن سے لیکر آج تک، ایک ملازم ہر وقت انکی اردل میں موجود ہوتا ہے۔ وہ روبوٹ کی طرح مجاہد بھائی پر نظر رکھتا ہے۔ پانی کا گلاس پکڑانا ہو، کھانے کی پلیٹ پہنچانی ہو، طعام کے بعد برتن اُٹھانے ہوں۔ یہ سب کام انکا ملازم احسن طریقے سے سرانجام دیتا ہے۔ کل بھی، ٹیلی ٹوپی پہنے ہوئے ایک خدمت گار موجود تھا۔ گاڑی میں بھی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ بھائی مجاہد، طبیعت اور قرینے کے لحاظ سے ایک بڑے زمیندار ہیں۔ ویسے بھٹو کی ریفارمز میں انکے والد کی کافی زمین، سرکار نے ضبط کر لی تھی۔ پر آج بھی بھائی مجاہد کے پاس کافی آبائی رقبہ ہے۔ تیس برس پہلے وہ بھی سمندری کی میونسپل کمیٹی کے چیئرمین رہے ہیں۔ ہاں تیس برس پہلے۔ مگر کل کی بات لگتی ہے۔

قاسم، ہشام، طاہر، عمران، سب سے ملاقات رہی۔ چچا عبدالرحیم کا بڑا بیٹا، آصف، امریکہ سے صرف اور صرف کاشف کی سیاست کو سہارا دینے کیلئے نو سال پہلے سمندری آ گیا۔ جب میں سیکرامینٹو (Sacramanto) گیا تو آصف کافی بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ سیکرامینٹو سے سمندری آنا بے حد دشوار فیصلہ تھا۔ مگر راؤ کاشف ایم پی اے بن چکا تھا۔ اسکی مصروفیت کے پیش نظر، مقامی سطح پر ایک منجھے ہوئے فرد کی ضرورت تھی جو شہر میں لوگوں کے ساتھ ہر وقت رابطے میں رہے۔ آصف نے جس محنت سے کام کیا، وہ کم از کم میرے لیے باعث حیرت بھی تھی اور باعث تسکین بھی۔ میرے چچازاد بھائی راؤ کاشف، دس سال مسلسل سمندری سے ایم پی اے رہا۔ جتنی ترقی اس نے اپنے حلقہ میں کروائی، وہ پورے صوبہ کے لیے مثالی ہے۔ سڑکوں کا جال، سٹیڈیم، ہسپتال کی ترقی اور دیگر معاملات حد درجہ ایماندارانہ طریقے سے انجام دیے۔ وہ چند سیاستدانوں میں سے ہے۔ جنکی ایمانداری ضرب المثل ہے۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو فضا میں اپنے دادا، والد اور چچا کی اَن دیکھی تصویر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس مٹی میں میرے عزیز ترین رشتے مٹی اوڑھے سو رہے ہیں۔ اس مٹی سے کم از کم میں تو ناطہ نہیں توڑ سکتا۔ شائد عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹی بے حد اہم ہو جاتی ہے!

راؤ منظر حیات